ڈاکٹر جمیل حیات
استاد، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، اٹک

منٹو کے افسانوں کا اختتامیہ

Abstracts

The finishing lines of Minto's short stories

By Dr. Jamil Hayat, AP Urdu, Govt. College, Attock.

Sadsat Hassan Minto was the greatest short story writer of Urdu language. He wrote many short stories. The main feature of Minto's short stories is suspense, and surprise. Minto took interest in Russian and French literature. He translate books and short stories from Russian language in to Urdu. This was a great task of Minto. Minto was the legendary fiction writer of his era. He was also the most famous Urdu fiction writer forever. Minto took inspiration from Mopsaa, and put his experience in to Urdu literature. This article deals with Minto's extream style. It also shows the real face of that society. It throws light on the finishing lines of Minto's short stories.

Keywords: Sadat Hassan Minto, Short story, Urdu language, Russian and French literature, Fiction, Guy de Maupassant, Finishing lines.

کلیدی الفاظ: سعادت حسن منٹو، افسانہ، اردو زبان، روسی اور فرنچ ادب، موپساں، اختتامیہ

اردو افسانے کی عمر اگرچہ اتنی زیادہ نہیں ہے لیکن اتنے مختصر عرصے میں بھی اس نے غیر معمولی ترقی کی۔پریم چند کے بعد افسانہ نگاروں کی ایک طویل قطار ہے۔بعض ایسے افسانے لکھے گئے جنھیں بلا شک و شبہ عالمی معیار کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔ بہت کم عرصے میں ہی اردو افسانے کو بڑے افسانہ نگار ملے جن میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری،ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، بانو قدسیہ وغیرہ نے عظیم افسانے تخلیق کیے۔

سعادت حسن منٹو کا نام کئی حوالوں سے خاص حیثیت کا حامل ہے۔منٹو، معاشرے کے پامال شدہ طبقے کانمائندہ افسانہ نگار ہے۔اردوادب خاص طور پرافسانے میں موضوعات اور تکنیک کی اختراع منٹو کی انفرادیت ہے۔منٹو نے اس دنیا کی عکاسی کی جو نفرتوں اور گمراہیوں کی دنیا تھی۔اس لیے منٹوکو اردو ادب کا سب سے بدنام افسانہ نگار بھی کہا جاتا ہے۔کیوں کہ جن موضوعات پر منٹو نے قلم اٹھایا ان کو بہت سے لوگ ممنوعات میں شمار کرتے تھے اور اُس زمانے میں ان پر لکھنا برا سمجھا جاتا تھا۔

منٹو کو اس کے زمانے میں لوگو ں نے نہ سمجھا اور نہ اس کے افسانوں کو لیکن بعد میں منٹو کی قدر ہوئی اور سال۲۰۲۱ء کو منٹو کے سال کے طور پر منایا گیا۔ منٹو پر بہت سے حوالوں سے لکھا گیا اس مضمون میں منٹو کے افسانوں کے اختتامیے پر بات کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عام طور پر منٹو کے افسانوں کا اختتام حیرت پر ہوتا ہے۔ تراجم کے حوالے سے بھی منٹونے بہت کام کیا۔وکٹر ہیوگو کی مشہور تصنیف THE LAST DAYS OF THE CONDEMONEDکا ترجمہ ”سرگزشتِ اسیر“کے نام سے کیا۔اسی طرح آسکر وائلڈ کی "ویرا"، کے علاوہ گورکی ، افانسیف، ٹالسٹائی، چیخوف،

سلوگب، چیریکوف اور وکٹر ہیوگو کے افسانوں کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا۔(۱) "عالمگیر" کا روسی ادب نمبر اور "ہمایوں "کا فرانسیسی ادب نمبر ان کی اس دلچسپی کا مظہر ہے۔(۲) اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ منٹو کی کہانیوں پر روسی ادیب چیخوف اور فرانسیسی ادیب موپساں کے اثرات نمایاں ہیں۔ موپساں کے افسانوں کی ایک خوبی حیرت پہ افسانوں کا اختتام ہے(۳)۔ موضوعات کے علاوہ فنی اور فکری اعتبار سے بھی منٹو موپساں سے بہت قریب تھے۔دیکھا جائے تو افسانے میں حیرت اور انکشاف کا عمل ہی بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ افسانہ نگار اسی عمل کے ذریعے قاری کو چونکاتا ہے۔ تجسس کے احساس سے گزرتے ہوئے منٹو نے بھی معمولی عمل میں غیر معمولی عمل کو ڈھونڈا۔

منٹو کے اسلوب کی بنیادی خصوصیات، چونکانے کی خواہش اور غیر متوقع انجام ہے۔ اور یہی خصائص فرانسیسی ادیب موپساں کی تحریروں میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ منٹو معاشرے کے ناسوروں سے ایسے جراثیم تلاش کر لیتا ہے جو معاشرتی برائیوں کا باعث بنتے ہیں۔اور یہی انکشافات قاری کو حیرت میں ڈالتے ہیں۔ یہ انکشافات منٹو کے افسانوں، نیا قانون، ہتک، بابو گوپی ناتھ،جانکی، ٹھنڈا گوشت، بلاؤز، خونی تھوک، کھول دو اور پھاہا میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ منٹو کے بے باکانہ لہجے اور مزاج کی ضد نے اس کے افسانوں میں جو تلخی اور تیکھا پن پیدا کیا وہ تیکھا پن اور تلخی ہی اس کا فن بن گیا ہے۔

منٹو کے افسانے حقائق پر مبنی ہیں۔اس نے جو دیکھا اسے من و عن پیش کر دیا۔ کسی بھی قسم کی رنگ آمیزی نہیں کی۔ وہ انسان دوست افسانہ نگار ہے۔ اگر وہ کچھ انسانوں کا مذاق اڑاتا ہے تو وہ ان کے اندر انسانیت کے بہترین عناصر کو تلاش بھی کرتا ہے۔ منٹو کے افسانوں کی خاص بات یہ ہے کہ وہ معمولی بات کو بھی غیر معمولی بنا کے پیش کرتا ہے۔ اس کے افسانوں کے اختتام پر یہ بات واضح طور پر دیکھی اور پڑھی جا سکتی ہے کہ اس کے افسانوں کا اختتام

حیرت پر ہوتا ہے۔ قاری سوچتا رہ جاتا ہے اور افسانہ ختم ہوجاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اختتام ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ منٹو قاری کے سوچنے کے لیے انجام چھوڑ دیتا ہے کہ قاری خود نتیجہ اخذ کرے کہ اس کے بعد کیا ہو گا۔ یا کیا ہونے کا امکان تھا۔ یہ اس کی خاص تیکنیک ہے کہ کبھی کبھی وہ غیر معمولی بات کو بڑے معمولی اور سیدھے سادے انداز میں بیان کر کے نکل جاتا ہے اور قاری مبہوت سوچتا رہ جاتاہے۔ اگرچہ بعض اوقات افسانے کا اختتام حیرت پر نہیں ہوتا لیکن قاری کے لیے حیرت کا سامان منٹو کا وہ سادہ اور عام فہم انداز ہوتا ہے جس پر افسانے کا اختتام ہوتا ہے اور قاری سوچتا رہ جاتا ہے۔

کھول دو"فسادات کے حوالے سے منٹو کا ایک شاہکار اور لازوال افسانہ ہے۔ سراج الدین کی بیٹی اس سے بچھڑ جاتی ہے۔ فسادات کا زمانہ ہے۔ وہ رضا کاروں سے کہتا ہے کہ میری بیٹی کو تلاش کر دو۔ اس کی نشانی چہرے پر موٹا سا تل ہے اور وہ بہت خوبصورت ہے۔ اس کا نام سکینہ ہے۔رضا کار مدد کا وعدہ کرتے ہیں۔پھر ایک دن رضا کاروں کو سکینہ مل جاتی ہے اور وہ اسے ساتھ لے جاتے ہیں۔لیکن سراج الدین کو وہ کہتے رہتے ہیں کہ سکینہ نہیں ملی۔ افسانے کی اختتامی سطریں دیکھیں جہاں افسانہ نگار نے کتنی خوبصورتی سے سکینہ پر ہونے والے رضا کاروں اور دیگر کئی جنسی درندوں کے جنسی حملوں کا ذکر کیے بغیر ان کے مکروہ چہروں سے پردہ اٹھایا ہے۔

> سراج الدین نے لاش کے زرد چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھا اور چلایا۔ سکینہ
>
> ڈاکٹر جس نے کمرے میں روشنی کی تھی سراج الدین سے پوچھا:'کیا ہے؟' سراج الدین کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا:'جی میں اس کا باپ ہوں۔'ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا اور اس کی نبض ٹٹولی اور سراج الدین سے

کہا: 'کھڑکی کھول دو۔'

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش ہوئی۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی۔ بوڑھا سراج الدین خاموشی سے چلایا۔ 'زندہ ہے... میری بیٹی زندہ ہے۔'

ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔(۴)

کہیں بھی افسانے میں منٹو نے سکینہ کے ساتھ ہونے والی جنسی درندگی کا ذکر نہیں کیا لیکن آخر میں سکینہ کے ہاتھوں ہونے والے بے ساختہ عمل نے اس کے ساتھ ہونے والی مسلسل جنسی درندگی کا پول کھول دیا۔قاسم یعقوب منٹو کے افسانے "کھول دو" کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کھول دو" کا مرکزی موضوع لڑکی کا ناڑا کھولنا یا اس کے ساتھ جنسی عمل نہیں، بل کہ اس افسانے میں جس ایک نکتے کو مرکز مانا گیا ہے وہ اس عمل کی سفاکی بیان کرنا ہے، جو اس لڑکی کے ساتھ ہم دردی اور تحفظ کے نام پر روا رکھی گئی ہے۔افسانے میں جنسی فعل کی تصویری منظر کشی کہیں بھی نہیں دکھائی گئی سوائے دو جگہوں پر ہمیں یہ تاثر دیا گیا گیا ہے کہ لڑکی کو استعمال کیا جا رہا ہے یا کر دیا گیا ہے۔ یہی تو منٹو کی فنکارانہ چابک دستی ہے، جس نے اتنا بھی زائد بتانے کی کوشش نہیں کی کہ اُس کے ساتھ کب، کہاں اور کتنا جنسی فعل ہو چکا ہے۔" (۵)

منٹو کے افسانوں کی نمایاں خوبی حقیقت نگاری ہے، منٹو کا کمال یہ ہے کہ اس نے جو دیکھا اسے بعینہ پیش کر دیا۔ اس سلسلے میں کئی افسانوں کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے لیکن "کھول دو"اس کا واضح ثبوت ہے

کہ جب بھی موقع ملتا ہے محافظ کمزور انسان کو مجبور اور بے بس پا کر فرائض کو بھول جاتے ہیں۔ یوں تھوڑی سی دیر کی لذت کی خاطر اپنے اعمال کو برباد کر دیتے ہیں اور اپنے نفس سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔قاسم یعقوب نے اس افسانے کی اختتامی سطروں کے حوالے سے کچھ اور بھی نتائج نکالے ہیں وہ کہتے ہیں:

> میرے خیال میں 'کھول دو' کا لفظ سنتے ہی لڑکی کا شلوار کو نیچے کرنے کا عمل ایک دم نہیں ہوا۔ اس کے پیچھے بھی 'جاری' نوعیت کا جنسی عمل ہو سکتا ہے۔ آپ افسانے کے اس حصے پر غور کریں کہ سراج الدین لڑکی کے اسپتال میں جانے کے کچھ دیر بعد اندر داخل ہوا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ دفعتاً روشنی ہوتی ہے۔ اس سے ایک اندازہ یہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاید ڈاکٹر لڑکی کے 'چمکتے تِل' کو 'چکھنے' کی کوشش کر رہا ہو۔ ڈاکٹر کا یہ کہنا 'کیا ہے؟' منٹو کا معمولی اشارہ نہیں۔ڈاکٹر کو پسینا آنا، اُس کی اپنی خجالت بھی ہو سکتی ہے کہ یہ تو اس کا باپ ہے۔" (۶)

منٹو اپنے افسانے "کھول دو" کے حوالے سے لکھتا ہے:

> قاسمی صاحب دوسرے روز شام کو تشریف لائے تو میں اپنے دوسرے افسانے کھول دو کی اختتامی سطور لکھ رہا تھا... افسانے کی اختتامی سطور چونکہ بہت ہی اہم تھیں اس لئے قاسمی صاحب کو کافی دیر انتظار کرنا پڑا...قاسمی صاحب نے افسانہ پڑھنا شروع کیا۔ اختتامی سطور پر پہنچے تو میں نے نوٹ کیا جیسے کسی نے ان کو جھنجوڑ دیا ہو۔(۷)

"گور مکھ سنگھ کی وصیت" بھی فساد کے دور کی کہانی ہے۔ایک مسلمان

گھرانہ جو کہ چار افراد پر مشتمل ہے؛ غیر مسلموں کے علاقے میں پھنس جاتا ہے۔ میاں عبدالحئی، ریٹائرڈ جج، ان کی بیٹی صغریٰ، ایک لڑکا اور ایک بوڑھا ملازم۔ جج صاحب نے گور مکھ سنگھ کو ایک جھوٹے مقدمے میں سزا سے بچایا تھا اسی ایک بات کی وجہ سے وہ جج صاحب کا ممنونِ احسان تھا اور ہر چھوٹی عید پر سوئیوں کا ایک تھیلا ان کے گھر لے کر آیا کرتا تھا۔ جب وہ مر گیا تو اس کا بیٹا سنتوکھ سنگھ یہ فرض ادا کرنے لگا۔ فساد کے موقع پر بھی وہ سوئیاں لے کر آیا تو جج صاحب بسترِ مرگ پر تھے۔ جب صغریٰ بتاتی ہے کہ جج صاحب بیمار ہیں تو اسے بہت دکھ ہوتا ہے وہ کہتا ہے:

> اوہ! سردار جی زندہ ہوتے تو انھیں یہ سن کر بہت دکھ ہوتا۔ مرتے دم تک انھیں جج صاحب کا احسان یاد تھااور کہتے تھے کہ وہ انسان نہیں دیوتا ہے۔ اللہ میاں انھیں زندہ رکھے۔ انھیں میرا سلام۔ "وہ فوراً مکان سے باہر نکلا تو ڈھاٹا پوش چار آدمی اس کے پاس آئے۔ دو کے پاس جلتی ہوئی شمعیں تھیں اور دو کے پاس مٹی کے تیل کے کنستر۔ ایک نے سنتوکھ سے پوچھا: 'کیوں سردار جی! اپنا کام کر آئے؟'سنتوکھ نے سر ہلا کر جواب دیا"'ہاں کر آیا۔'اس آدمی نے ڈھاٹے کے اندر ہنس کر پوچھا:'تو کر دیں معاملہ ٹھنڈا جج صاحب کا۔''ہاں۔۔۔جیسی تمھاری مرضی۔'یہ کہہ کر سردار گور مکھ سنگھ کا لڑکا چل دیا۔(۸)

منٹو کے افسانے کا یہ اختتام قاری کے لیے حیرت کا باعث ضرور ہے لیکن اس میں کسی بھی قسم کی رنگ آمیزی نہیں ہے۔ حقیقت پسندانہ انجام ہے۔یہ منٹو کا اپنا فن ہے وہ اس فن کا موجد بھی ہے اور خاتم بھی۔ اس لیے وہ منفرد ہے۔ اطہر پرویز لکھتے ہیں:

> منٹو اپنے افسانے کے مواد کو اپنے کہانی کہنے کے ڈھنگ میں مکمل طور پر ہم آہنگ کر لیتا ہے اور مواد اس کی تیکنیک کے فریم میں اچھی طرح جم جاتا ہے اور اپنی جگہ بنا لیتا ہے اور پڑھنے کے بعد ہمارے ذہن کو دھکا نہیں لگتا۔(۹)

منٹو کے کردار فطری ہوتے ہیں۔ ان میں کہیں تصنع نہیں ہوتا۔ اسے پتا ہے کہ کون سی بات کہاں کہنی ہے اس لیے وہ قاری کی دلچسپی کو قائم رکھتا ہے۔ ممد بھائی، منٹو کا جانا پہچانا کردار ہے۔ ایسے کردار جو کہ دوسروں کے کام آتے ہیں؛ کوئی عجوبہ نہیں ہوتے۔ یہ کہانی اردو ادب میں اپنے اختتام کی وجہ سے زندہ رہے گی۔ ممد بھائی صرف صوبہ بدر ہونے سے بچنے کے لیے مونچھیں کٹواتا ہے اور پھر بھی سزا سے نہیں بچ سکتا تو پچھتاتا ہے۔ ممد بھائی کا یہ تاسف اور مونچھیں کٹوانا ہی افسانے اور کردار میں جان ڈال دیتا ہے۔(۱۰)

افسانہ "دو قومیں" کو لے لیجیے۔ اس کا ہیرو مختار مسلمان اور ہیروئن شاردا ہندو ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ شادی کے لیے مختار اسے مسلمان ہونے کو کہتا ہے جب کہ شاردا کہتی ہے کہ مختار ہندو ہو جائے۔ اس پر مختار اسلام کی تعریف اور ہندو مذہب کی برائی کرتا ہے تو شاردا اسے جانے کو کہتی ہے۔

> "جاؤ... چلے جاؤ... ہمارا ہندو مذہب بہت برا ہے تم مسلمان بہت اچھے ہو۔' شاردا کے لہجے میں نفرت تھی۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ مختار اپنا اسلام دبائے وہاں سے چلا گیا۔"(۱۱)

آخری جملے کو دیکھیے۔ منٹو نے اس کے بعد کوئی تقریر نہیں کی۔ اور قاری کے سوچنے کے لیے بہت کچھ چھوڑ دیا۔ "سڑک کے کنارے" منٹو کا ایک اور شاہکار افسانہ ہے۔ ذرا اس کے اختتام پر نظر ڈالتے ہیں۔

> لاہور ۱۲ جنوری... دھوبی منڈی سے پولس نے ایک

> نوزائیدہ بچی کو سردی سے ٹھٹھرے، سڑک کے کنارے پڑی ہوئی پایا۔ اور اپنے قبضے میں لے لیا۔ کسی سنگدل نے بچی کی گردن کو مضبوطی سے کپڑے میں جکڑ رکھا تھا اورعریاں جسم کو گیلے کپڑے میں باندھ رکھا تھاتا کہ وہ سردی سے مر جائے مگر وہ زندہ تھی۔ بچی بہت خوبصورت ہے۔ آنکھیں نیلی ہیں۔ اس کو ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔(۱۲)

یہ ایک اخبار کی سیدھی سادی خبر ہے جس پر منٹو نے اس افسانے کا اختتام کیا ہے۔یہ بچی جو کہ دو پیار کرنے والوں کے گناہ کی نشانی ہے جس میں ایک نیلی آنکھوں والا مرد عورت سے جسمانی ملاپ کرتا ہے۔ اور جب عورت امید سے ہوتی ہے تو وہ بے نیاز ہو کر نکل جاتا ہے۔ عورت کبھی تو ماں بن کے سوچتی ہے تو اسے اپنا بچہ بہت اچھا لگتا ہے لیکن کبھی سوچتی ہے کہ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے۔ آخر میں وہ کہتی ہے کہ انگلیاں اٹھتی ہیں تو اٹھنے دو۔ چنانچہ اس صورت حال میں قاری اس کا انجام یہی سوچتا ہے کہ عورت بچے کو جنم دے گی اور اپنے پاس رکھے گی۔ لیکن عظیم فنکار، منٹو افسانے کو کیا حیرت انگیز ٹچ دیتا ہے۔ کوئی اور افسانہ نگار ہوتا تو صرف ایک بچہ لکھ کر بات ختم کر دیتالیکن منٹو نے اس معاشرے کو برائی کا مرکز بنا دیا ہے اور چکر در چکر کا سلسلہ شروع کر دیا جہاں پھر ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے اس حلقے میں شامل ہونے کے لیے جس کا چکر شاید کبھی ختم نہ ہو۔(۱۳)

منٹو کے افسانے "کالی شلوار"کا مرکزی کردار، سلطانہ ہے جسے محرم کے لیے کالی شلوار کی ضرورت ہے۔ وہ شنکرکو کالی شلوار لانے کو کہتی ہے تو وہ اس کے کانوں کے بُندے لے کر چلا جاتا ہے اور پھر محرم کی پہلی تاریخ کو اسے کالی شلوار دے دیتا ہے۔بالکل ویسی جیسی اس نے انوری کے ہاں دیکھی تھی۔ چنانچہ جب وہ کپڑے پہن لیتی ہے تو دروازے پر دستک ہوتی ہے۔

سلطانہ نے دروازہ کھولا تو انوری داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا:'قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے پر یہ شلوار نئی ہے۔ کب بنوائی؟' سلطانہ نے جواب دیا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں انوری کے کانوں پر پڑیں۔ 'یہ بُندے تم نے کہاں سے لیے؟'انوری نے جواب دیا:'آج ہی منگوائے ہیں۔'اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر تک خاموش رہنا پڑا۔(۱۴)

منٹو کی یہی خوبی اس کے اور بہت سے افسانوں کے آخر میں ظاہر ہوتی ہے۔ "نیا قانون"برِصغیر کے لوگوں کو سہولیات دینے سے متعلق منٹو کا مشہور افسانہ ہے۔جس میں منگو کوچوان مختلف پڑھے لکھے لوگوں سے سنتا ہے کہ اپریل کی پہلی تاریخ کو انگریز حکمران ہندوستانیوں کے لیے نیا قانون لا رہے ہیں جس سے انھیں آزادی مل جائے گی تو وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ پہلی اپریل کو وہ تانگے کو خوب سجا کر بازار کی سیر کرنے نکلتا ہے اور جب ایک گورا اس سے بدتمیزی کرتا ہے تو اسے غصہ آجاتا ہے کہ پہلی تاریخ کو بھی وہی اکڑفوں۔ وہ گورے کو پیٹ ڈالتا ہے کہ اب نیا قانون ہے اور ہماری حکومت ہے۔ اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے جہاں اسے بتایا جاتا ہے کہ وہی پرانا قانون ہی ہے۔(۱۵)منٹو کے ایک اور افسانے "ٹھنڈا گوشت"کی اختتامی سطریں ملاحظہ کریں۔

ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کے جسم کی طرف دیکھا جس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔"وہ...وہ مری ہوئی لاش تھی...بالکل ٹھنڈا گوشت...جانی مجھے اپنا ہاتھ دے..."کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ پر رکھا جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔(۱۶)

کلونت کور کی جسمانی پکار پر جب ایشر سنگھ کوئی جواب نہیں دیتا تو غصے کی کیفیت میں کلونت جو کہ اس کی بیوی ہے اس کی کرپان سے اس کا خون کر دیتی ہے۔زندگی کی آخری سانسیں لیتے وہ کلونت کور کو بتاتا ہے کہ اس کی مردانگی کس وجہ سے ختم ہوئی۔ قاری کو حیرت ہوتی ہے کہ کلونت کور کے ردِّ عمل کے نتیجے میں زندگی ہارتے ایشر سنگھ کے چہرے پر ملال کا کوئی عکس نظر نہیں آتا بل کہ جب وہ بیانِ حلفی دیتا ہے کہ وہ لڑکی جسے وہ فسادات کے دنوں میں اپنی جنسی بھوک کو مٹانے کی خاطر کندھے پر ڈال کر بھاگا تھا اور وہ لڑکی خوف کی شدّت کی وجہ سے جنسی عمل سے پہلے ہی مر گئی تھی توجب اس لڑکی کی موت کا انکشاف ایشر سنگھ پر ہوا تو وہ قوتِ مردمی کھو بیٹھا تو کلونت کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی حیرت کا شدید جھٹکا لگتا ہے۔ چنانچہ مرتے وقت ملال کی بجائے اطمینان کا عکس یہ بتا رہا ہے کہ زندگی کی قیمت پر ایشر کے اس گناہ کا کفارہ ادا ہو گیا ہے۔

''پھاہا''کی تو ابتدا ہی حیرت کے عنصر سے ہوتی ہے جب گوپال کی ران پر بڑا سا پھوڑا نکلتا ہے تو اس کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ مصنف یہ بتاتا ہے کہ گوپال کے ابا ایک مرہم گھر لے کے آتے ہیں اور اپنی بیوی کو بتاتے ہیں کہ پھنسیوں اورپھاہوں پر لگانے کے لیے دوا ہے تو گوپال اور اس کی چھوٹی بہن نرملا بھی سن لیتے ہیں۔ گوپال اپنی گیارہ سالہ بہن نرملا کو اپنے پھوڑے کے بارے میں بتاتا ہے اور پھر نرملا اس کا پھوڑا دیکھ کرجو ابھار کی طرح کا ہوتا ہے اس پر پھاہا رکھ دیتی ہے کیونکہ گوپال اپنی ماں کی عدم موجودگی میں وہ مرہم نکال لیتا ہے۔گوپال اسے بتاتا ہے کہ یہ دوا لگانے سے پھوڑا خود ہی ختم ہو جائے گا۔ پھر جب نرملا اس سے پوچھتی ہے کہ یہ پھوڑے کیوں نکلتے ہیں تو گوپال اسے بتاتا ہے کہ گرم چیزیں کھانے سے۔ اس پر نرملا کو وہ دو انڈے یاد آجاتے ہیں جو اس نے دو ماہ پہلے کھائے تھے۔ تو وہ کچھ سوچنے لگتی ہے۔ اب ذرا اس افسانے کی اختتامی سطریں ملاحظہ کریں۔ منٹو نے کیا کمال کا اختتام کیا ہے افسانے کا جو قاری سوچ بھی نہیں سکتا۔

بڑے کوٹھے کو طے کر کے دروازے کے اندر داخل ہونے ہی والا تھا کہ اس کے قدم رُک گئے۔ صندوق کے پاس بیٹھی نرملا کچھ کر رہی تھی گوپال پیچھے ہٹ گیا اور چھپ کر دیکھنے لگا۔نرملا بڑے انہماک سے پھاہا تراش رہی تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں قینچی سے بڑا نفیس کام لے رہی تھیں۔ پھاہا کاٹنے کے بعد اس نے تھوڑا سا مرہم نکال کر اس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کرتے کے بٹن کھولے۔سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا ابھار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نلکی پر صابن کا چھوٹا سا نا مکمل بلبلہ اٹکا ہوا ہو۔ نرملا نے پھاہے پر پھونک ماری اوراسے اس ننھے سے ابھار پر جما دیا۔(۱۷)

منٹو کا کمال ہی یہی ہے کہ وہ ایسا انجام سامنے لاتا ہے جس کے بارے میں قاری سوچ بھی نہیں سکتا۔ سیدھی سادی کہانی چل رہی ہوتی ہے اور اچانک منٹو اُس کو ایسا رخ دے دیتا ہے کہ قاری ورطہء حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ یہ کیا ہو گیا اور پھر اس کے منہ سے بے ساختہ کلماتِ تحسین نکلتے ہیں۔

''سجدہ''میں حمید نامی ایک نوجوان اپنے نمازی دوست ملک عبدالرحمان کو دھوکے سے شراب پلا دیتا ہے اور جب اس کا دوست اسے کہتا ہے کہ تم نے اچھا نہیں کیا تو حمید توبہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکرانے کا سجدہ کرتا ہے کہ اس نے حمید کو اتنی توفیق دی کہ وہ شراب چھوڑ دے لیکن ڈیڑھ ماہ بعد اس کا وہی دوست وہسکی لے کے آجاتا ہے اور اسے بھی پلا تا ہے۔ تب اسے پتا چلتا ہے کہ وہ جانتا تھا کہ اسے شراب پلائی جا رہی ہے اور یہ کہ وہ پیتا رہا تھا۔ تب حمید بھی سجدے کے احساس سے پیچھا چھڑانے کے لیے پینا شروع کر دیتا ہے۔اس بات کو سات سال گزر جاتے ہیں۔ حمید جب بھی اپنے کمرے میں جاتا ہے

تو سات سال پہلے کی اس تصویر کو دیکھ کر اسے روحانی تکلیف ہوتی ہے جو اس نے توبہ کرنے کے بعد شاید کھنچوائی تھی۔ اس افسانے کا اختتام بھی حیران کن ہے۔

> وہ گھبرا کر اٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا جیسے وہ اُس سجدے کا نشان مٹانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو پھر کرسی پر بیٹھ گیا... سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔"اے خدا! میرا سجدہ مجھے واپس دے دے...
> (۱۸)

"کبوتروں والا سائیں"کا انجام بھی حیران کن ہے جہاں افسانے کے شروع سے منٹو یہ تاثر دیتا ہے کہ عبدالغفار پاگل ہے اور اسے غیب کی باتوں کا کوئی علم نہیں۔بہت سے لوگ اس سے اپنے مسائل کا حل پوچھتے ہیں اور وہ لایعنی باتیں کرتا ہے جس سے وہ مفہوم نکال لیتے ہیں۔ افسانے کی ہیروئن نیتی بھی اس سے پوچھتی ہے کہ وہ تھکتی نہیں، وہ کب تھکے گی تو وہ اسے کہتا ہے کہ جلد۔گاؤں میں سندر جاٹ نامی ڈاکو کے ڈاکہ مارنے کی خبر سائیں کی ماں کو ہوتی ہے جسے سن کر اس کا ایک بیٹا گاؤں سے بھاگ جاتا ہے جس رات ڈاکہ ڈالا جاتا ہے اس سے اگلی صبح نیتی گاؤں سے غائب ہو جاتی ہے۔ آخری سطریں دیکھیں جہاں ایک بار پھر منٹو نے قاری کی سوچ کے برعکس سائیں کو حقیقی مجذوب کے روپ میں پیش کر کے اس کو ذہنی دھچکا پہنچایا ہے۔

> رحمان نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا بھائی عبدالغفار آستین سے اپنے منہ کا لعاب پونچھ رہا تھا۔ رحمان نے گھور کر دیکھا اور پوچھا۔'کیا کہا تھا اس نے تجھ سے'عبدالغفار الاؤ کے پاس بیٹھ گیا۔'وہ کہتی تھی کہ

میں تھکتی ہی نہیں... پر اب وہ تھک جائے گی۔'رحمان نے تیزی سے پوچھا 'وہ کیسے؟'غفار سائیں کے چہرے پر ایک بے معنی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔'مجھے کیا معلوم؟... سندر جاٹ جانے اور وہ جانے۔'یہ سن کر رحمان کے چہرے پر اور زردی چھا گئی اور مائی جیواں کی جھریاں اور زیادہ گہرائی اختیار کر گئیں۔"(۱۹)

"سونے کی انگوٹھی"میں بیوی اپنے شوہر سے اس کے سر کے بالوں کے حوالے سے ہی بات کرتی رہتی ہے کہ اتنے بڑے ہو گئے ہیں اس لیے ان کی حجامت کرا لو۔میاں اور بیوی کے درمیان مختلف باتوں پر بحث ہوتی ہے۔آخر میں بیوی تنگ آکر کہتی ہے کہ آپ حجام کے پاس جائیں اور اپنے بال کٹوائیں۔ آخری لائنیں دیکھیں:

"زیادہ باتیں مت کیجیے...سیدھے حجام کے پاس جایئے... اور یہ اپنے سر کا بوجھ اتروایئے...جاتا ہوں... کوئی اور کام ہو تو بتاؤ..." "میرا کوئی کام نہیں... آپ اس بہانے سے مجھے ٹالنا چاہتے ہیں۔" "اچھا تو میں چلا... " "ٹھہریے۔" "ٹھہر گیا...فرمایئے..." "آپ کے بٹوے میں کتنے روپے ہوں گے۔" "پانچ سو کے قریب..." "تو یوں کیجیے... بال کٹوانے سے پہلے انار کلی سے سونے کی ایک انگوٹھی لے آیئے... آج میری ایک سہیلی کی سالگرہ ہے... دو ڈھائی سو روپے کی ہوگی۔" میری تو وہیں انارکلی ہی میں حجامت ہو جائے گی... میں جاتا ہوں۔(۲۰)

" تانگے والے کا بھائی"ایک ایسا افسانہ ہے جو کہ اپنے اختتام کی وجہ سے یاد رکھا جائے گا۔ اس افسانے میں مصنف اپنے ایک دوست سے پوچھتے

ہیں کہ وہ اسے اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ سنائے۔ دوست بتاتا ہے کہ اس نے کبھی خرافات میں الجھنے کی کوشش نہیں کی لیکن دوستوں نے ایک بار اسے مجبور کیا تو وہ طوائف کو لانے پر مجبور ہو گیا جس تانگے والے کو انھوں نے طوائف کا انتظام کرنے کا کہا وہ شاہ صاحب کو پرہیزگار سمجھتا تھا تاہم وہ بندوبست کرنے چلا گیا۔ آخری سطریں دیکھیے جہاں منٹو حسبِ معمول اپنے قارئین کو حیرت زدہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔

> اس کو ٹٹولا... تو وہ بالکل سپاٹ تھی۔ آخر میں نے زبردستی اس کا برقع الٹ دیا۔میری حیرت کی انتہا نہ رہی...جب دیکھا کہ وہ عورت نہیں... ہیجڑا تھا... نہایت مکروہ قسم کا...! مجھے سخت غصہ آیامیں نے اس سے پوچھا۔"یہ کیا واہیات پن ہے؟"اس ہیجڑے نے جس کے چہرے پر روؤں کا نیلا غبار موجود تھابڑے نسوانی انداز میں جواب دیا۔"میں... تانگے والے کا بھائی ہوں۔" شاہ صاحب نے اس کے بعد مجھ سے کہا،منٹو صاحب! اس دن کے بعد مجھے اس سلسلے سے کوئی رغبت نہیں رہی۔(۲۱)

"جسم اور روح"کا لبِ لباب یہ ہے کہ ایک نوجون مجیب ایسی خوبی سے معمور ہے کہ جس آدمی سے ایک بار مل لیتا ہے یا جسے ایک نظر دیکھ لیتا ہے اس کے بارے میں پوری تفصیل سے آگاہ کر سکتا ہے کہ اس نے کیسے کپڑے پہن رکھے تھے یا کس قسم کا زیور پہنا تھا۔ اسے ایک لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے اور جب اس لڑکی کو معلوم ہوتا ہے کہ مجیب ایک نظر میں سب کچھ جان جاتا ہے تو وہ اس سے شادی کرنے پر تیا رہو جاتی ہے۔آخر میں مصنف ہمیں بتاتا ہے:

> ان کی شادی ہو گئی... دلہن نے کیسے کپڑے پہنے تھے، اس

کی دائیں کلائی میں کس ڈیزائن کی دست لچھی تھی...اس میں کتنے نگینے تھے... یہ سب تفصیلات اس نے ہمیں بتائیں۔ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں میں طلاق ہو گئی۔(۲۲)

قاری ذہنی طور پر کہانی کے خوشگوار انجام کے لیے اپنے آپ کو تیار کر چکا ہوتا ہے اور منٹو ایک اچھوتا اور نرالا اختتام لے کے حاضر ہو جاتا ہے۔ یہی منٹو کا کمال ہے۔ منٹو کے پاس قلم نہیں تیز نشتر تھا جس سے وہ سماج کی ناڑیوں میں سے گندہ خون نکالتا تھا۔ وہ حکیم نہیں تھا، سرجن تھا۔ اُس کی تیز نگاہ سماج کو دیکھنے کے لیے ڈبل لینز کا کام کرتی تھی۔ اس کے بیان میں رس تھا۔(۲۳)

"قیمے کی بجائے بوٹیاں"کا انجام بھی حیرت ناک ہے۔ اس افسانے میں ڈاکٹر سعید جو کہ مصنف کا دوست ہے اپنی دوسری بیوی کے ہاتھوں بہت تنگ ہوتا ہے جس نے ایک دن اپنی نوکرانیوں اور نوکروں سے مل کے سعید کی ٹھیک ٹھاک پٹائی کی تو مصنف نے اسے طعنہ دیا کہ تمھاری جگہ میں ہوتا تو قیمہ کر دیتا اس کا۔ آخری سطریں دیکھیں جہاں قاری کے لیے حیرت کا سامان موجود ہے کیونکہ سعید جو کہ بزدلی کی حد تک شریف آدمی ہے عجیب کام کرتا ہے۔:

"میں نے پھر غور سے دیکھا... قطعی طور پر انسانی بانہیں تھیں... سمجھ میں نہ آیا...یہ قصہ کیا ہے؟...قصائی کی چھری اور کلہاڑی چل رہی تھی۔ چار دیگوں میں پیاز سرخ کی جا رہی تھی...ڈاکٹر سعید نمودار ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی پکارا: 'آیئے... آیئے...آپ کے کہنے کے مطابق قیمہ تو نہ بن سکا۔ مگر یہ بوٹیاں تیار کر لی گئی ہیں... ابھی اچھی طرح بھونی نہیں گئیں۔ ورنہ میں آپ کو ایک بوٹی پیش کرتا... یہ

معلوم کرنے کے لیے مرچ مصالحہ ٹھیک ہے یا
نہیں۔(۲۴)

یہ منٹو کی خوبی ہے کہ اس نے اگر کسی طوائف پر افسانہ لکھا ہے تو اس طوائف کی ذات، شخصیت، اس کے خیالات و میلانات و رجحانات،اس کی تہذیب و تمدن، اس کا عاشق مزاج مردوں سے میل جول، میل ملاپ، محفل کے آداب، محفل کی نشست و برخاست اور کاروبار کے ڈھب سب بیان کر دیے ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں اس دور کی تہذیب اپنے اصل رنگ میں ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

''دودا پہلوان''ایک خوبصورت اور بانکے امیر زادے کی کہانی ہے جو ایک طوائف زادی الماس پہ مرتا ہے۔ اس سے پہلے کئی طوائفوں پر وہ اپنا تمام مال و اسباب خرچ کر چکا ہوتا ہے۔ الماس کی ننھی اتروانے کی قیمت اس کی ماں دس ہزار روپے مانگتی ہے جو صلاحو کے پاس نہیں ہوتے دوسری طرف اس کو قرقی سے بچنے کے لیے بھی دس ہزار روپوں کی ضرورت ہے لیکن وہ اپنے محافظ دودے پہلوان کو کہتا ہے کہ بندو بست کرو کیونکہ وہ الماس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔دودا پہلوان آخرکار اسے دس ہزار روپے لا کر دیتا ہے تو وہ قرقی کو بھول کر پھر الماس کے ڈیرے کا رخ کرتا ہے تو دودا اسے وہاں جانے سے منع کرتا ہے۔ دودے میں باقی عیب تو ہوتے ہیں لیکن وہ لنگوٹ کا پکا ہے آخری سطریں دیکھیں منٹو نے حسبِ معمول قاری کو حیران کیا ہے اور افسانے کو کیا رخ دے کر ختم کیا ہے۔

''صلاحو طیش میں آگیا:'تو کون ہوتا ہے مجھے روکنے والا'دودے کی آواز نرم ہو گئی'میں تیرا غلام ہوں باؤ۔ پر اب الماس کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔'دودے کی آواز میں لرزش سی پیدا ہو گئی:'نہ پوچھ باؤ۔ یہ روپیہ مجھے اسی نے دیا ہے۔'صلاحو قریب قریب چیخ اٹھا:'یہ روپیہ الماس

نے دیا ہے۔ تمھیں دیا ہے؟"ہاں باؤ۔ اسی نے دیا ہے۔ مجھ پر بہت دیر سے مرتی تھی سالی پر میں اس کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ تجھ پر تکلیف کا وقت آیا تو میرے دل نے کہا۔ دودے چھوڑ اپنی قسم کو...تیرا باؤ تجھ سے قربانی مانگتا ہے۔ سو میں کل رات اس کے پاس گیااور۔اور...اور اس سے سودا کر لیا۔'دودے کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔(۲۵)

منٹو ایک بلند پایہ اور عظیم فنکار تھا۔ اس کے افسانوں "ہتک" اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کے مقابلے میں اردو کا کوئی افسانہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔فنکارانہ خیالات اور نرالے طرزِ اسلوب کی وجہ سے منٹو کے افسانے ایک منفرد حیثیت کے حامل رہیں گے۔غیر متوقع انجام منٹو کے افسانو ں کی خوبی ہے اور یہی منٹو کی پہچان بن گیا ہے۔ اس کے متعدد افسانوں میں حیران کن انجام سامنے آتا ہے ان میں اس کے افسانوی مجموعے "پھُندنے"میں شامل افسانوں مسٹر معین الدین، سودا بیچنے والی اور مس اڈنا جیکسن۔"یزید"میں شامل افسانوں یزید، ۱۹۱۹ کی ایک بات اور چور"چغد" میں شامل افسانوں چغد، پڑھیے کلمہ اور جانکی ۔"ٹھنڈا گوشت"کے افسانوں باسط اور شاردا۔"سرکنڈوں کے پیچھے"کے افسانوں جاؤ حنیف جاؤ، شادی، بچنی، سرکنڈوں کے پیچھے اور وہ لڑکی وغیرہ شامل ہیں۔

منٹو اردو ادب میں نابغے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے افسانے جو کہ حقیقت نگاری کی اعلیٰ مثالیں ہیں اپنے اچھوتے اور حیران کن انجام کی وجہ سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ان کی وجہ سے منٹو کا نام بھی زندہ جاوید رہے گا۔

حواشی

۱۔ افضالہ شاہین، تاریخ ادب،(اٹک: سرمد اکادمی، ۲۰۱۱ء)،ص ۹۵
۲۔ ایضاً
۳۔ ایضاً، ص ۴۰
۴۔ سعادت حسن منٹو، منٹو کے بہترین افسانے، مرتبہ اطہر پرویز، (لاہور: مکتبۂ شعر و ادب، س ن)، ص ۳۷۱
۵۔ قاسم یعقوب،غلیظ بدن اور فحش ذہن سے بنا منٹو، مشمولہ کتابی سلسلہ زیست، شمارہ ۹، دسمبر ۲۰۱۵ء، ادارۂ رموز، ص۱۵۴
۶۔ ایضاً، ص ۶۵۴
۷۔ سعادت حسن منٹو، منٹونامہ، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۵۵۳
۸۔ سعادت حسن منٹو، منٹو کے بہترین افسانے، مرتبہ طارق محمود، (لاہور: بک ٹاک، ۲۰۱۰ء)، ص ۴۴۱
۹۔ سعادت حسن منٹو، منٹو کے بہترین افسانے، مرتبہ اطہر پرویز، ص۲۴
۱۰۔ ایضاً، ص۱۰۱
۱۱۔ ایضاً، ص۳۴
۱۲۔ ایضاً، ص۲۲۷
۱۳۔ ایضاً، ص ۰۵
۱۴۔ ایضاً، ص ۹۷
۱۵۔ ایضاً، ص ۴۶
۱۶۔ سعادت حسن منٹو، منٹونامہ، ص ۱۱۴
۱۷۔ سعادت حسن منٹو، منٹوباقیات، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص۱۱۳
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۲ ۳
۱۹۔ ایضاً، ص ۲۳۳
۲۰۔ سعادت حسن منٹو، منٹونامہ، ص ۵۱۷
۲۱۔ ایضاً، ص۱۲۷
۲۲۔ ایضاً، ص ۷۵۷
۲۳۔ بلونت گارگی، حسین چہرے، مشمولہ منٹو کے بہترین افسانے، مرتبہ اطہر پرویز، ،ص ۱۵
۲۴۔ سعادت حسن منٹو،منٹو کے بہترین افسانے، مرتبہ طارق محمود، ص۲۵
۲۵۔ ایضاً، منٹونامہ، ص ۷۵

مآخذ

۱۔ شاہین، افضالہ، تارینۂ ادب، اٹک: سرمد اکادمی، ۲۰۱۱ء
۲۔ منٹو، سعادت حسن، منٹو کے بہترین افسانے، مرتب اطہر پرویز، لاہور: مکتبہ شعر و ادب، س ن
۳۔ ____، منٹو کے بہترین افسانے، مرتب طارق محمود، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۱۰ء
۴۔ ____، منٹو باقیات، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء
۵۔ ____، منٹو نامہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

رسائل و اخبارات

۱۔ کتابی سلسلہ زیست، کراچی، شمارہ ۹، دسمبر ۲۰۱۵ء، ادارہ رموز

Footnotes

1. Afzala Shaheen, *Tareena-e-Adab*, (Attock, Sarmad Academy, 2011), p. 95
2. Ibid p. 95
3. Ibid, p. 30
4. Saadat Hasan Manto, *Manto kay behtreen Afsanay*, Compilted by Athar Pervaiz, (Lahore: Maktaba-e-Shair-o-Adab, n. d.), p. 371
5. Qasim Yaqoob, *Ghaleez badan aur fohosh Zehn say bana Manto*, in magazine *Zeest*, Karachi, Issue 9, Dec. 2015, Idara-e-Ramooz, p. 154
6. Ibid, p. 653
7. Saadat Hasan Manto, *Manto Nama*, (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2011), p. 553
8. Saadat Hasan Manto, *Manto kay behtreen Afsanay*, Compilted by Tariq Mehmood, (Lahore: Book Talk, 2010), p. 441
9. Saadat Hasan Manto, *Manto kay behtreen Afsanay*, Compilted by Athar Pervaiz, p24
10. Ibid, p. 101
11. Ibid, p. 34
12. Ibid, p. 722
13. Ibid, p. 5
14. Ibid, p. 97
15. Ibid, p. 36
16. Saadat Hasan Manto, *Manto Nama*, p. 114
17. Saadat Hasan Manto, *Manto Baqiyaat*, (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2004), p. 113
18. Ibid, p. 312
19. Ibid, p. 233
20. Saadat Hasan Manto, *Manto Nama*, p. 517

21. Ibid, p. 127
22. Ibid, p. 757
23. Balwant Gaargi, *Haseen Chehray*, in *Manto kay behtreen Afsanay*, Compilted by Athar Pervaiz, p. 15
24. Saadat Hasan Manto, *Manto kay behtreen Afsanay*, Compilted by Tariq Mehmood, p. 25
25. Saadat Hasan Manto, *Manto Nama*, p. 75

Bibliography

1. Manto, Saadat Hasan, *Manto kay behtreen Afsanay*, Compilted by Athar Pervaiz, Lahore: Maktaba-e-Shair-o-Adab, n. d.
2. ____, *Manto kay behtreen Afsanay*, Compiled by Tariq Mehmood, Lahore: Book Talk, 2010
3. ____, *Manto Baqiyaat*, Lahore: Sang-e-Meel, Publications, 2004
4. ____, *Manto Nama*, ____, ____,, 2011
5. Shaheen, Afzala, *Tareena-e-Adab*, Attock: Sarmad Academy, 2011

Magazines:

1. Kitabi Silsila *Zeesat*, Karachi, Issue no. 9, Dec. 2015, Idara-e-Ramooz